محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۳۰ء میں محمد باقر کے ہاں دلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ ایرانی خاتون تھیں۔ لہٰذا فارسی ان کی مادری زبان تھی۔ وہ عربی بھی بخوبی جانتے تھے۔ ابتدائی تعلیم عربی و فارسی اپنے والد سے حاصل کی پھر ابتداء میں ایک مکتب میں اور آخر میں دلی کالج میں داخلہ لیا۔ ان کے والد محمد باقر نے ۱۸۵۷ء میں دہلی سے پہلا اردو اخبار نکالا۔ یوں اسی ادبی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔

آزاد اردو کے وہ مایہ ناز انشا پرداز ہیں۔ جن پر زبان اردو ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ وہ شعر بھی کہتے تھے بلکہ جدید اردو شاعری کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی۔ لیکن ان کی اصل شہرت ان کی نثر کی وجہ سے ہے اسی نثر کی وجہ سے انہیں اردو کا بہترین انشاء پرداز کہا جاتا ہے۔ وہ آزاد شاعر ہونے کے ساتھ نقاد، سوانح نگار، مؤرخ اور ایک مخصوص طرز کے نثر نگار تھے۔ ان کی کتابوں میں سخندان فارس، آب حیات، دربار اکبری اور نیرنگِ خیال زیادہ مشہور ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد دہلی سے دکن چلے گئے۔ واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہوگئے۔ ۱۸۸۷ء میں اُن کو "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا گیا۔ آخری ایام میں وہ دماغی امراض میں مبتلا ہوئے اور اسی عالم دیوانگی میں ۱۹۱۰ء میں اُن کا انتقال دکن میں ہوا۔

سیرِ زندگی

(محمد حسین آزاد)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلباء کو تخیلاتی نثر سے متعلق معلومات بہم پہنچانا۔
۲۔ طلباء کے لیے زندگی کی معنویت میں اضافہ کرنا۔
۳۔ طلباء کو آزاد کے اسلوب نثر سے متعارف کروانا۔

مشکل الفاظ: انبوہ ، بے لاگ ، حاجت ، رفاقت ، سکت ، گرداب

ایک حکیم کا قول ہے کہ ''زندگی ایک میلہ ہے'' اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پختہ سال انسان ہوئے۔ اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے۔ جب اس فقرہ پر غور کیا اور آدمی کی ادلتی بدلتی حالت کا تصور کیا تو مجھے انواع واقسام کے خیال گزرے۔ اول تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم ادنیٰ ادنیٰ چیز کا محتاج ہے پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طلب گار ہوتا ہے۔ ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے اور جو اس کے برخلاف ہے اس کا عاشق زار ہوتا ہے۔

پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیراتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعتاً درد ومصیبت کی فریاد خوشی کے ولولے، ڈر کی چیخیں، ہواؤں کے زور، پانی کے شور ایسے اٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا۔

اول تو دل بہت حیران ہوا۔ بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے ہوئے تو آس پاس کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا کہ ہم کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔ اور اس غل کا کیا سبب ہے؟ ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب کہاں جاتے ہیں۔ دریائے حیات میں تیر رہے ہو۔ پہلے تو لڑکپن کی نہر تھی کہ جس میں کچھ کشتیوں کی کمزوری سے، کچھ ملاحوں کی غفلت سے کچھ ان کی بے وقوفی سے لاکھوں بھائی بند غارت ہوگئے۔ وہ نہر تو ہم اتر آئے ہیں۔ اب منجھدار سمندر ہے

اور ہم ہیں۔ کبھی طوفان ہے کبھی گرداب ہے۔ کبھی موجوں کے تھپیڑے کھارہے ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں۔ ملاح بھی اس لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کیئے ہیں جو رستہ بتانے اور پار اتار دینے کے دعوے باندھے بیٹھے تھے۔ مگر حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش جاتی ہے نہ ملاح کی فقط خدا کی آس ہے اور بس۔

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

یہ سن کر میں نے ادھر ادھر غور سے دیکھنا شروع کیا اور دل نے کہا کہ پہلے نظر اٹھا کر تو دیکھ لو۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایک نہر خوش نما گلزار کے بیچ میں لہراتی چلی جاتی ہے۔ ہمراہی میرے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس کی لہروں میں ظاہر نہ کچھ زور تھا نہ شور تھا۔ مگر جو شخص ذرا ہاتھ ڈالتا تھا وہ اسے بلبلے کی طرح بہالے جاتی تھی۔ ان گلزاروں کا کچھ حال دیکھنا چاہو تو بالکل اندھیرا تھا اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ باغ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی جس نے آنکھ کھولی تھی اپنے تئیں باغ ہی میں دیکھا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے بھی پانی ہی پانی تھا کہ اپنی لہر میں بہتا چلا جاتا تھا اور دھند اتنی چھائی ہوئی تھی کہ تیز سے تیز نظر بھی کام نہ کرتی تھی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دریا میں بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں ہیں اور جا بجا گرداب پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اپنی اپنی کشتیوں میں بادِ مراد کے مزے لیتے چلے جاتے تھے۔ اور جو بیچارے پیچھے رہ گئے تھے ان پر قہقہے اڑاتے جاتے تھے مگر یہ بھی ہنستے ہنستے انہی گردابوں میں ڈوبتے جاتے تھے۔ دلوں کا اضطراب اور آنکھوں کا اندھیرا یہ غضب تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی مشکل سے سنبھل سکتا تھا۔ انہی میں ایسے لوگ بھی تھے کہ ناواقفیت و نادانی کے سبب سے اپنے ساتھیوں کو گردابوں میں ڈال دیتے تھے اور موجوں کے تھپیڑے انہیں چٹانوں پر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔ پانی برابر لہریں مارتا چلا جاتا تھا اور کشتی کو اس کی ٹکر پر چڑھالانے کا تو کیا ذکر ہے اتنی مجال نہ تھی کہ کوئی پہلو کاٹ کر بھی دھارے کے سامنے سے چڑھ آئے۔ کاش کہ جہاں سے چلا تھا پھر وہیں آجائے۔ سب اپنی اپنی کشتیوں کو برابر روک تھام سے سنبھالے چلے جاتے تھے۔ اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ خطرہ نہیں۔ اگر ہے تو اور ہمسفروں کو ہے۔ اوروں کے انجام دیکھ رہے تھے اور اپنی بدانجامی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خود اپنی مصیبت میں مبتلا تھے اور اپنا خیال نہ کرتے تھے جب موجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بداعمالی جو پر سے پر ملائے برابر عالم ہوا میں اڑتی چلی جاتی تھیں وہ لوگوں کو بہلا لیتی تھیں۔ ہر شخص خوش ہوتا تھا اور دل میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا تھا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میری کشتی کو کچھ خطرہ نہیں ہے۔ جو گرداب اوروں کو نگل گیا میں اس سے بچ جاؤں گا اور جن چٹانوں

نے اور کشتیوں کو ٹکرا کر ڈبو دیا میں انہیں بھی بے لاگ پھاند جاؤں گا۔ غفلت نے ایسا پردہ آنکھوں پر ڈالا تھا کہ ساتھ کے جہازوں کی تباہی بھی دیکھتے تھے مگر اسی رستے چلے جاتے تھے۔ اس بے پروائی کا یہ حال تھا کہ دم بھر اور طرف متوجہ ہوتے تھے تو چپو بھی ہاتھ سے رکھ کر بھول جاتے تھے۔ پھر ناچار ہو کر اپنے تئیں قسمت پر چھوڑ دیتے تھے۔

یہ سستی اور بے پروائی ان کی کچھ اس لئے نہ تھی کہ ایسی زندگی سے سیر ہو گئے تھے کیونکہ جب ڈوبنے لگتے تھے تو سب چلاتے تھے۔ داد بیداد کرتے تھے اور اپنے اپنے دوستوں کو چیخیں مار مار کر پکارتے تھے کہ برائے خدا کوئی آؤ اور ہمیں سنبھالو۔ اور اکثر آخر وقت میں لوگوں کو نصیحتیں بھی کرتے تھے کہ ہم تو اپنی حماقتوں کی بدولت ان حالتوں کو پہنچے تم بچے رہنا۔ چنانچہ ان کی اس ہمدردی اور محبت پرستی پر بہت سی تعریفیں بھی ہوتی تھیں مگر ذرا سی دیر میں پھر بھول جاتے تھے۔ نہ وہ آپ سمجھتے تھے نہ ان کی نصیحت پر کوئی اور عمل کرتا تھا۔ اِدھر اُدھر جزیروں کے کناروں پر کشتیاں اور جہاز ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ بہت سے مسافروں کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ بہتیرے نیم جان بہتیرے ایسی بے کسی اور تکلیف کی حالتوں میں تڑپتے تھے کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ ایک دوسرے کو ان کی مصیبت دکھا کر عبرت دلاتا تھا مگر اپنے دل پر ذرا اثر نہ لاتا تھا۔ جس کشتی پر ہم سوار تھے حق یہ ہے کہ اس کے جوڑ بند بھی دریائے حیات کی موجوں کے صدمے اٹھانے کے قابل نہ تھے۔ بلکہ رستے ہی میں ٹوٹتے نظر آتے تھے اور سب ساتھیوں کو یقین تھا کہ کیسی ہی پھرتی کریں یا زور لگائیں ڈوبنے سے بچتے نہیں۔

جب ان آفتوں کا باہم چرچا ہوا تو جو مستِ غفلت زندگی کے نشہ سے سرخوش بیٹھے تھے وہ بھی غمگین ہو گئے۔ اچھے اچھے دلیروں کے دل ڈر گئے اور بزدلوں نامردوں کو زندگی عذاب موت ہو گئی۔ بلکہ رنج وغم کے بعد جن جن راحتوں کی امید ہوتی ہے۔ اس سے بالکل مایوس ہو گئے مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس آفت میں زیادہ خطرہ تھا وہی زیادہ تر بے پروا تھے بلکہ سب کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس خطرے کا خیال دور ہی دور رہے اور جو جانتے تھے کہ آگے ایسی مصیبتیں آئیں گی جو اٹھائی نہ جائیں گی وہ سامنے نگاہ بھر کے بھی نہ دیکھتے تھے اس وقت کے لئے کچھ نہ کچھ مشغلے نکال لیتے تھے۔ امید تو ہمیشہ اس رستے میں ساتھ ہی رہتی تھی اس سے ہنس کھیل کر دل بہلاتے رہتے تھے۔

جن لوگوں کو امید سے بہت راہ تھی ان سے اس نے رفاقت کے بڑے بڑے وعدے کر رکھے تھے مگر اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی جس کے سہارے سے بھاگ کر بچ جاتے۔ فقط اتنا وعدہ تھا کہ اوروں سے کچھ پیچھے ڈوبو گے اور یہ بھولے بھالے احمق اتنے ہی وعدے پر راضی تھے۔ درحقیقت امید کی باتیں ان سے مسخرے پن کے طور پر تھیں کیونکہ

جتنی جتنی ان کی کشتیاں پرانی ہوتی جاتی تھیں اتنی ہی بے خبری کے عہد نامے تازہ کرتی تھیں اور تعجب یہ ہے کہ جنہیں ڈوبنے کا یقین تھا وہی کاروبار کے لئے زیادہ کمر کستے تھے۔

دریائے زندگی میں ایک بہت بڑا جزیرہ نظر آیا۔ اس کے کنارے پر دریا سے لگا ہوا ایک بلند منارہ تھا۔ اس پر سونے کے حرفوں سے لکھا تھا۔ ”بداعتدالیوں کا گلزار“ جہاں تک جزیرے کی حد تھی وہاں تک پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانیں بلند تھیں۔ اسی واسطے ایسے ہیبت ناک گرداب پڑتے تھے۔ جہاں سے کشتی کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ یہ چٹانیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور جتنی کھلی تھیں، نہایت سرسبز اور خوشنما تھیں۔ جوانانِ مرغزار یعنی ہرے بھرے درخت ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے جھوم رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں۔ آرام وہیں اپنی پلنگڑی بچھائے لیٹا تھا اور خوشی بیٹھے بیٹھے سروں میں پڑی ایک ترانہ لہرا رہی تھی۔ یہی مقام رہ گزر عام تھا۔ اس لئے جو لوگ ادھر سے گزرتے تھے یہاں کی سرسبزی ان کی آنکھوں میں ضرور طراوت دیتی تھی۔

ادراک کا ناخدا داہنے ہاتھ پر دوربین لگائے کھڑا تھا کہ مسافروں کو اسی سکڑے راستے سے نکال لے جاتا تھا۔ مگر خرابی یہ تھی کہ وہ کشتی کھینچنے کے لئے ان سے ڈنڈا مانگتا تھا کہ صحیح سلامت یہاں سے نکال دے۔ یہ اس باغ سبز پر ایسے محو ہو رہے تھے کہ جواب بھی نہ دیتے تھے۔ خواہ وہ خفا ہو کر کہے، خواہ منتوں سے مانگے۔ تھوڑے ہی ہوں گے جو اس کا کہنا بھی مانتے ہوں گے اور دیتے تھے تو اس شرط پر دیتے تھے کہ ان سبزہ زاروں کے پاس سے ہو کر نکلنا کہ ذرا دیکھ کر ہی دل خوش کر لیں اور عہد لے لو کہ پھر رستہ بھر ہم کہیں نہ اٹکیں گے۔ نہ سمجھتے تھے کہ برتنا تو در کنار ان بلاؤں کے پاس تو نکلنا بھی غضب ہے چھوا اور موا۔

میں نے دیکھا کہ آخر ادراک چابکدست ان کے تقاضوں اور منتوں سے دق ہو گیا اور جزیرہ مذکور کی طرف لے چلا اس جزیرے نے کشتی کو اس طرح کھینچا جیسے مقناطیس سوئی کو کھینچے۔ جانے والے بھی گئے تو سہی مگر بہت پچھتائے اور جتنا زور تھا سب لگا۔ لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلی۔ غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناچ کود کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جانیں گنوا بیٹھے۔ ہاں جن لوگوں پر ادراک چابکدست کی چالاکی، تدبیر کارگر ہوئی وہ بچے مگر بڑے دکھ اٹھا کر بچے اور نکلے تو جس طرح پہلے جاتے تھے اسی طرح موجوں کے تھپیڑوں میں پڑ گئے۔ پانی کے تلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی اور یہ بھی بادِ مخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لئے جاتے تھے۔ آخر ادھر ان کے زور گھٹتے گئے ادھر کشتی حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے۔ خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ سب ڈوب گئے مگر جو ڈوبتا تھا اپنی کوتاہ اندیشی پر

بہت پچھتاتا تھا اور اوروں کو نصیحت کرتا جاتا تھا کہ۔

من نہ کردم شما حذر بکنید [1]

خدا کی قدرت کہ جو ایسی ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی مرمت کرتے تھے ان کے کاریگر بھی وہیں موجود تھے۔ بہت لوگوں کو اپنی کاریگروں پر بڑا بھروسہ تھا اور بعض کشتیاں بھی ایسی تھیں کہ انہیں تھوڑا ہی صدمہ پہنچا تھا مگر معلوم ہوا کہ جنہوں نے تھوڑا صدمہ اٹھایا تھا وہ بھی کچھ بہت نہ جئے روز بروز مرض بڑھتا گیا آخر ڈوب ہی گئے بلکہ تعجب یہ ہے کہ بعض ضرب رسیدہ ایسے تھے کہ کاریگروں نے خود ان کی مدد سے پہلو بچایا۔ مگر بہتیرے کاری گر خود ضرب رسیدوں سے پہلے ڈوب گئے کہ وہ خود اپنی آفتوں میں مبتلا تھے۔

غرض سیر زندگی میں چالاک لوگوں نے بھی اگر پایا تو اتنا ہی پایا کہ یہ کچھ پیچھے ڈوبے وہ پہلے ڈوبے۔ بہتیرے مسافر ایسے بھی تھے کہ لڑکپن سے جن ہمراہیوں کے ساتھ چلے آتے تھے انہیں غوطے کھاتے دیکھتے جاتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے یعنی بادمخالف برابر غرق کیے جاتی تھی۔ نہ ان بیچاروں کو محنت تدبیر کرنی پڑتی تھی نہ غم انتظار اٹھانا پڑتا تھا۔ جو لوگ خوشی کی ٹکر کھا کر بچ نکلے تھے وہ بھی آہستہ آہستہ ضعیف ہی ہوتے گئے۔ اگرچہ ہاتھ پاؤں مار مار کر پانی سے بہت لڑے مگر جو اوروں پر پہلے گزری تھی وہ ان پر پیچھے گزری۔ آخر معلوم ہوا کہ امید کو بھی کنارہ کامیابی تک پہنچنا مشکل ہے۔ یہ حالات دیکھ کر میرا دل ایسا زندگی سے بیزار ہوا کہ جی میں آیا آنکھیں بند کر کے اس دریا میں کود پڑوں۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نورانی صورت سبز لباس پہنے سامنے کھڑا ہے اور اپنے عصا سے اشارہ کر کے پاس بلاتا ہے۔ میں نزدیک گیا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر پھیرا اور عصا اٹھا کر سامنے اشارہ کیا۔ خدا جانے دوربین الٰہی سے میری آنکھیں روشن کر دیں یا کہر جو دھواں دھار ہو رہی تھی اسے اپنی برکت سے اڑا دیا۔ دیکھوں تو سبحان اللہ صبح صادق کا وقت ہے۔ چمن کے لہلہے، مرغان سحر کے چہچہے، پھولوں پر شبنم، صبا اور نسیم کم کم، جزیرے کے جزیرے میوؤں سے جھومتے اور پھولوں سے لہلہاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سمندر کا پانی جگمگ جگمگ لہریں مار رہا ہے۔ بڑے بڑے امرا، شرفا، خلعت ہائے فاخرہ اور زرق برق لباس پہنے پھولوں کے طرے سر پر، ہار گلے میں ڈالے ادھر ادھر درختوں میں شعر پڑھتے پھرتے ہیں۔ کچھ فواروں کے نیچے حوض میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ کچھ پھولوں کی کیاریوں میں بے تکلف لوٹتے ہیں اور گانا سن رہے ہیں۔ غرض کہ ہجوم بہار اور رسیلی آوازوں کی تانوں نے وہ جھمکٹ کر رکھا تھا کہ شور قیامت بھی آئے تو خبر نہ ہو۔

---

[1] ترجمہ:۔ میں نہیں بچ سکا لیکن تم اس سے بچو۔

اس عالم کو دیکھ کر میرا ساغر دل خوشی سے چھلک گیا اور بے اختیار یہی جی چاہا کہ اگر باز کے پر ہاتھ آجائیں تو اڑوں اور اس باغ فرح بخش میں جا پڑوں، لیکن اس پیر بزرگ نے کہا کہ وہاں جانے کا کوئی رستہ نہیں۔ الا دروازۂ موت کہ جس سے تم ڈرتے ہو۔ دیکھو وہ سرسبز اور رنگین جزیرے جو سامنے نظر آتے ہیں اور سمندر کے قالین پر گلکاری کر رہے ہیں۔ حقیقت میں اس سمندر سے بھی زیادہ پھیلاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں تک تمہاری نظر کام کرسکے بلکہ جہاں تک تمہارا خیال دوڑ سکے اس سے بھی آگے تک لاانتہا چلے جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد نیک مردوں اور صاحب دلوں کے گھر یہیں ہوں گے۔ جن جن لذتوں کو جی چاہے اور طبیعت اٹھائے سب یہاں موجود ہیں۔ ہر جزیرہ باغ جنت کا مکان ہے کہ اپنے اپنے مکین کے لائق شان ہے کیوں آزاد کیا یہ مقام اس لائق نہیں کہ جان تک بھی ہو تو دیجیے اور انہیں لیجیے؟ کیا اس زندگی کو مصیبت سمجھنا چاہیے جس کی بدولت یہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ کیا موت سے ڈرنا چاہیے؟ کیا ملک عدم کو خوش ہو کر نہیں چلنا چاہیے۔ جس کی بدولت ایسی ایسی نعمتیں حاصل ہوں؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں اور سنتے ہو؟ یہ سمجھنا کہ انسان جس کے لئے یہ بے زوال سامان ہیں اسے یونہی پیدا کر دیا ہے؟ دنیا مقام امتحان ہے ہم تم یہاں امتحان دینے آئے ہیں۔ امتحان کا نام سنتے ہی میں چونک پڑا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو کچھ نہ تھا۔

(نیرنگ خیال)

مشق

ا۔ درج ذیل سوالات کے جوابات تحریر کریں۔

(الف) سیر زندگی میں ایک حکیم کا کیا قول ہے؟

(ب) منجھدھار سمندر سے کیا مراد ہے؟

(ج) مصنف نے خوش نما گلزار کے بیچ میں نہر کی جو حالت بیان کی ہے اُسے مختصراً لکھیں۔

(د) ملاح خطرے اور موت کو سامنے دیکھ کر پھر بھی کیوں بے خطر کشتی چلا رہے تھے؟

(ہ) ڈوبنے والے ساتھیوں کو آخری وقت میں کیا نصیحت کرتے تھے؟

(و) آفتوں کے چرچے کے بعد زندگی کے نشے میں مست افراد پر کیا بیتی؟

(ز) دریائے زندگی میں لوگوں کو بڑا جزیرہ کہاں نظر آیا؟

(ح) ادراک کا ناخدا مسافروں کو نکالنے میں کیونکر مدد کر رہا تھا؟

(ط) بیچ سمندر پانی کے طلاطم کا کیا عالم تھا؟

(ی) باغ فرح بخش میں مصنف نے کیا پایا؟

۲۔ ''میرا مقصدِ حیات'' کے عنوان پر مضمون تحریر کریں۔

۳۔ درج ذیل الفاظ و محاورات کے معنی لکھیں۔

حاجت ۔ غارت ۔ گرداب ۔ بے لاگ ۔ حواس ٹھکانے ہونا ۔ سکت ۔ انبوہ ۔ رفاقت

۴۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۵۔ مصنف کا نام، سبق کا عنوان اور حوالہ متن دے کر درج ذیل پیراگراف کو سلیس اُردو میں لکھیں۔

میں نے دیکھا کہ آخر ادراک چابکدست ان کے تقاضوں اور منتوں سے دق ہو گیا اور جزیرہ مذکور کی طرف لے چلا اس جزیرے نے کشتی کو اس طرح کھینچا جیسے مقناطیس سوئی کو کھینچے۔ جانے والے بھی گئے تو سہی مگر بہت پچھتائے اور جتنا زور تھا سب لگا۔ لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلی۔ غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناچ کود کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جانیں گنوا بیٹھے۔ ہاں جن لوگوں پر ادراک چابکدست کی چالاکی، تدبیر کارگر ہوئی وہ بچے مگر بڑے دکھ اٹھا کر بچے اور نکلے تو جس طرح پہلے جاتے تھے اسی طرح موجوں کے تھپیڑوں میں پڑ گئے۔ پانی کے طلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی اور یہ بھی بادِ مخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لئے جاتے تھے۔ آخر ادھر ان کے زور گھٹتے گئے ادھر کشتی حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے۔

۶۔ درج ذیل الفاظ کے جمع لکھیں۔

آفت ۔ حالت ۔ تماشہ ۔ حاجت ۔ قسم ۔ سبب ۔ منت

۷۔ درج ذیل تراکیب کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ اُن کے معنی واضح ہو جائیں۔

بادِ مخالف ۔ دریائے زندگی ۔ مست غفلت ۔ بادِ مراد ۔ سیر زندگی

۸۔ درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

مصیبت ۔ حیات ۔ غفلت ۔ حقیقت ۔ چرچا

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ طلبہ کو زندگی میں پیش آنے والے مختلف حالات سے آگاہ کریں۔

۲۔ طلبہ کو زندگی گزارنے کا اصل مقصد بتائیں۔ ۳۔ محمد حسین آزاد کی نثر کے اسلوب کی خصوصیات سے آگاہ کریں۔